شیکسپیئر کے سانیٹ

(نیا اردو ترجمہ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری☆

Abstract

Shakespear is a legendry poet and dramatist of English language. His literary work has universal appeal.Given the importance of his work and the message he successfully conveyed through his writings, his work has been translated in most of the world's languages. Though his dramas and poetry have also been translated in Urdu language but his sonnets were yet to be rendered in Urdu. Mr. Though Zulifqar Ali Khan Baqa is relatively a less famous man in the literary world of Urdu, he came forward and translated Shakespear's sonnets into Urdu. This article is an analytical study of Mr.Baqa's translation of Shakespear's sonnets.

ولیم شیکسپیئر (۱۵۶۴ء-۱۶۱۶ء) انگریزی ادب ہی کا نہیں، عالمی ادبیات کا بھی ایک عظیم نام ہے۔ اس کے تخلیقی سرمائے کی اپیل آفاق گیر ہے اور اس کا سکہ ہر کہیں چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیقات کا ترجمہ دنیا بھر کی بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اردو زبان کا دامن بھی ان سدا بہار پھولوں سے خالی نہیں ہے۔ اس ضمن میں زیادہ تر سرمایہ شیکسپیئر

☆ پروفیسر شعبہ اردو، کلیہ شرقیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

کے ڈراموں کے ترجموں پر مشتمل ہے جس کے آثار انیسویں صدی عیسوی کے اواخر سے ملنے لگتے ہیں۔ ابتدا میں ایسی کاوشیں مختلف تھیٹریکل کمپنیوں کے توسط سے منظر عام پر آئیں اور ان کمپنیوں کے ساتھ وابستہ ڈراما نگاروں کی مرہونِ احسان ہیں۔ بعد میں انفرادی سطح پر بھی یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی، مترجمین کے اس کارواں میں احسن لکھنوی سے لیکر آغا حشر کاشمیری تک اور عنایت اللہ دہلوی سے لے کر سیف زلفی تک بیسیوں اہلِ قلم شامل ہیں۔

جہاں تک شیکسپیئر کے سانیٹس (sonnets) کا تعلق ہے، ان کی طرف اردو مترجمین کی توجہ نسبتاً کم رہی ہے۔ اور اگرچہ ان سانیٹس کو اردو میں منتقل کرنے کی متعدد جزوی کاوشیں ہوئی ہیں مگر شاید ہی کسی مترجم نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہو۔ ۱۹۹۸ء میں اس کام کا بیڑا نسبتاً کم معروف تخلیق کار ذوالفقار علی خان بقا نے اٹھایا اور مختصر سے عرصے میں شیکسپیئر کے ۱۵۴ سانیٹس کا منظوم اردو ترجمہ کر ڈالا۔ شیکسپیئر کے ادبی آثار کے کلیات مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس میں sonnets کی ذیل میں اتنے ہی فن پارے شامل ہیں (۱) یہی کلیات مترجم کا ماخذ ہے۔ مذکورہ کلیات میں شامل بعض خاص عنوانات کے تحت لکھے گئے سلسلۂ منظومات مثلاً "The Passionate Pilgrim" اور "Sonnets to Sundry" "Notes of Music" میں جگہ پانے والے (۲) چند متفرق سانیٹس سے قطع نظر، ذوالفقار علی خان بقا نے شیکسپیئر کے کم وبیش تمام سانیٹس کو اردو میں منتقل کرنے کا امتیاز حاصل کیا ہے۔ انھوں نے اپنی اس سعیِ جمیل کو ''آبِ گُل'' کا نام دے رکھا ہے جو دس سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی ہنوز ایک غیر مطبوعہ مسودے کی صورت میں ہے۔ راقم کو اسے دیکھنے، اور اس کا مطالعہ کرنے کا موقع میسّر آیا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اگرچہ ذوالفقار علی خان بقا کے پاس ''آبِ گُل'' سے پیش تر کسی ادبی وشعری تصنیف کے ترجمے کا تجربہ نہیں تھا تاہم وہ اس کام کے لیے درکار صلاحیتوں کے حامل ہونے کی بنا پر، ناموزوں بھی نہ تھے۔ وہ خود کلاسیکی ضابطوں کے پابند ایک خوش نوا غزل گو شاعر ہیں اور ان کا ایک شعری مجموعہ بھی ''گُلِ صد برگ'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ (۳)

یہ الگ بات ہے کہ پراپیگنڈے کی سہولت کے عدم حصول اور کسی خاص ادبی گروہ سے عدم وابستگی کے باعث ان کی شناخت کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ بہرحال وہ شاعری کے اسرار و رموز سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انھیں متعدد زبانوں کا درک حاصل ہے۔ پنجابی اور اردو تو خیر، خانہ زاد ہیں، وہ ان زبانوں کے بھی اچھے خاصے ماہر ہیں جو اردو کی مربی زبانیں ہونے کا درجہ رکھتی ہیں۔یعنی فارسی اور عربی۔عربی میں تو انھوں نے آنرز کی ڈگری بھی لے رکھی ہے۔رہی بات انگریزی کی، تو رسمی تعلیم کے ابتدائی مدارج سے لے کر ایل ایل بی کی ڈگری تک کے تمام مرحلوں میں یہ زبان ساتھ ساتھ رہی ہے۔ چنانچہ ان کی انگریزی دانی کا عملی اظہار اسلام کے نظامِ عدل سے متعلق ان کی تالیف

"The Holy Quran and Administration of Justice"

میں بھی ہو چکا ہے۔(۳) یہاں ذوالفقار علی خاں بقا کے تعارف میں اس امر کا بیان بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وسیلہ ءرزق شعبہ ءعدل و انصاف کو بنائے رکھا ہے اور وہ عدلیہ میں اہم مناصب پر فائز رہے ہیں۔ وہ ۳۱۔دسمبر ۱۹۹۸ءکو اپنی مدتِ ملازمت کی تکمیل پر ڈسٹرکٹ وسیشن جج (بہاولپور) کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ہاں! عدلیہ سے یاد آیا کہ انھوں نے ''آبِ گل'' کے دیباچے (بیگار) میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ اس کتاب کی تکمیل میں ثاقب رزمی مرحوم کی حوصلہ افزائی اور تشویق کا بھی دخل ہے۔ اور موصوف نے تعریف کے انداز میں کہا تھا:

''کاش آپ ادب میں ہوتے۔عدلیہ میں کہاں پھنس گئے؟''

لیکن میری رائے میں ادب پوری زندگی پر حاوی ہے اور اس کا عدلیہ سمیت کسی بھی شعبہ ءزندگی سے کوئی تضاد یا تصادم نہیں ہے۔ہم علامہ اقبال سے لے کر ظفر اقبال تک ایسے دسیوں مشاہیر ادب سے واقف ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت میں عدلیہ سے منسلک رہے یا اب وابستہ ہیں۔ ذوالفقار علی خان بقا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ دراصل حقیقی اہمیت کسی خاص شعبہ ءزندگی کے ساتھ وابستگی کو نہیں بلکہ اس قوتِ اظہار (potential of expression) کو حاصل ہے جو کسی شخص کو

قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور وہ مختلف اکتسابی ذرائع سے اس میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے ذوالفقار علی خان بقاؔ بھی عدلیہ سے وابستہ ہونے کے باوصف ادب کی خدمت کا پورا حق رکھتے تھے۔ ''آبِ گل'' بھی اسی حق کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس حق کو استعمال کیسے کیا گیا ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ذوالفقار علی خان بقاؔ انگریزی زبان کے شعر پاروں کو اردو زبان کا لباس پہنانے کی استعداد پوری طرح سے رکھتے ہیں لیکن انھوں نے عجلت سے کام لے کر ''آبِ گل'' میں بعض موقعوں پر اپنی استعداد کو صحیح معنوں میں بروے کار آنے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے اتنا بڑا پراجیکٹ صرف پانچ ہفتوں میں مکمل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے کم عرصے میں شعر پاروں، اور وہ بھی شیکسپیئر جیسے نابغہ شاعر کے سانیٹوں پر اس قدر غور و فکر کرنا بہت مشکل ہے، جس قدر اس کی ضرورت ہے۔ یہ امر بھی پیشِ نظر ہے کہ ''آبِ گل'' میں شامل تمام ترجموں میں یکساں معیار کے برقرار رہنے میں محض مترجم کی تعجیل ہی حائل نہیں ہوئی بلکہ اس کے کچھ عمومی اسباب بھی ہیں۔ ادبی متون، خصوصاً شعر پاروں کا مترجم خواہ کتنا ہی منجھا ہوا کیوں نہ ہو، تجدیدِ تخلیق (renewal of creation) کی ہر ممکن کوشش کے باوجود، وہ اپنے تراجم کو بہ تمام و کمال تخلیق کا ہم رتبہ بنانے سے قاصر رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مترجم تو کیا، خود تخلیق کار کے لیے بھی اپنے تخلیقی عمل کے پُر اسرار تجربے اور پُر پیچ سفر کی باز آفرینی محال ہے۔ یہ تو ایک دریا میں دوبار اترنے والا معاملہ ہے۔ اس ہفت خواں کو طے کرنے کا امکان اس صورت میں تو بالکل ہی معدوم ہو جاتا ہے جب مترجم اور اس کی زبان کا تہذیبی پس منظر تخلیق کار اور اس کی زبان کے تہذیبی پس منظر سے یکسر مختلف ہو۔ ''آبِ گل'' کا مطالعہ کرتے ہوئے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ انگریزی اور اردو کے لسانی خاندان ایک دوسرے سے جدا ہیں اور دونوں زبانوں کے صرفی و نحوی قواعد ہی نہیں، بدیع و بیان اور معانی وغیرہ کے معیارات بھی بالکل مختلف ہیں۔ دونوں کے طرزِ املا، نظامِ اصوات اور اوزان و بحور وغیرہ میں بھی مطابقت نہیں ہے۔ چنانچہ بہت سے لسانی و فنی پہلوؤں سے بھی مترجم کو بہر حال دستبردار ہونا پڑتا

ہے۔ سنجیدہ قاری یہ بات سمجھتا ہے اور مذکورہ مجبوریوں کے ساتھ خاموش مفاہمت پر آمادہ رہتا ہے۔ لیکن بعض موقعوں پر مترجم کے ایسے تجاوزات بھی سامنے آجاتے ہیں، جن کے ساتھ ذوقی یا تکنیکی یا دونوں سطحوں پر مفاہمت کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ''آب گل'' میں بھی بعض امور میں اور بعض مواقع پر مترجم سے اختلاف کی گنجائش نکل آتی ہے۔ پہلا اختلافی مسئلہ ترجمے کے لیے اختیار کردہ شعری ہیئت کا ہے۔

ذوالفقار علی خان بقا اس اعتبار سے تو لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے ترجمے کے لیے نثر یا نثری نظم کا صیغۂ اظہار اپنا کر سانیٹ جیسی غنائی صنفِ شعر کو آہنگِ نغمہ سے یکسر محروم کر دینے کی جسارت نہیں کی بلکہ معرّا نظم (blank verse) اور آزاد نظم (free verse) کی امتزاجی ہیئت اختیار کر کے غنائیت (lyricism) کا تأثر قائم کرنے کی سعی کی ہے، لیکن اگر وہ سانیٹ کے ہیئتی تقاضوں کو پورا کر دیتے تو ہمارے ذوق کی تسکین کے لیے مزید سامان فراہم ہو جاتا۔ مغرب میں سانیٹ کی شناخت چودہ مصرعوں، خاص بحر ___ آئمبک پینٹا میٹر (iambic pentameter) اور مخصوص ترتیب قوافی (rhyme scheme) سے عبارت ہے۔ جہاں تک سانیٹ کی قدیم اور بنیادی ترتیب قوافی کا تعلق ہے، وہی ہے جو اس صنفِ شعر کے باوا آدم، چودھویں صدی عیسوی کے مقبول و محبوب اطالوی شاعر پٹرارک (Petrarch) نے اختیار کی تھی۔ اطالوی سانیٹ (Italian sonnet) یا کلاسیکی سانیٹ (classical sonnet) کو اسی کے نام پر پٹرارکی سانیٹ (Petrarchan sonnet) بھی کہا جاتا ہے۔ پٹرارکی سانیٹ کے چودہ مصرعے ایک مثمن (octave) اور ایک مسدس (sestet) میں منقسم ہوتے ہیں۔ دونوں میں کل ملا کر کبھی چار اور اکثر پانچ قافیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثمن کے قافیے تو متعین (اب ب اا ب ب ا) ہیں جبکہ مسدس کے قافیوں میں متنوع صورتیں (ج د ج د ج د / ج د ہ ج د ہ / ج د ہ د ج ہ۔ وغیرہ) اپنانے کی روایت موجود ہے۔

یوں تو انگریزی شاعری میں پٹرارکی سانیٹ کی بھرپور تقلید کی گئی، تاہم سولھویں صدی عیسوی میں معروف شاعر اسپنسر (Spenser) اور عظیم شاعر شیکسپیئر (Shakespear) کے توسط

سے انحراف کی دو شکلیں سامنے آئیں جو بالترتیب اسپنسری سانیٹ (Spenserian sonnet) اور شیکسپیئری سانیٹ (Shakespearian sonnet) کے ناموں سے مشہور ہوئیں۔ پٹرارکی سانیٹ کے برعکس سانیٹ کی یہ دونوں شکلیں ایک مثمن اور ایک مسدس پر مبنی ہونے کے بجائے جداگانہ ترتیبِ قوافی کے ساتھ تین مربعوں (quatrains) اور ایک بیت (couplet) پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اسپنسری سانیٹ میں قدرے پیچیدہ ترتیب کے ساتھ پانچ قافیے (اب اب + ب ج ب ج + ج دج د + ہ ہ) استعمال کیے جاتے ہیں۔ گویا پہلے مربعے کے دوسرے قافیے کو دوسرے مربعے کا پہلا قافیہ اور دوسرے مربعے کے دوسرے قافیے کو تیسرے مربعے کا پہلا قافیہ بنا کر تینوں مربعوں کو ایک طرح کی زنجیرِ قوافی میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسپنسری سانیٹ زیادہ مقبول و مروّج نہ ہو سکی۔ شیکسپیئر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے پانچ قافیوں کے بجائے سات قافیوں (اب اب + ج دج د + ہ وہ و + ز ز) کے استعمال کو رواج دیا اور اسپنسری سانیٹ کی مذکورہ پیچیدگی کو دور کر کے ترتیبِ قوافی کے لحاظ سے سانیٹ کی ہیت کو روانی اور سہولت سے ہمکنار کر دیا۔ چنانچہ انگریزی شاعری میں شیکسپیئری سانیٹ کو اس قدر پذیرائی حاصل ہوئی کہ اس کے لیے انگریزی سانیٹ (English sonnet) کی اصطلاح بھی رواج پا گئی۔

دنیا بھر کی متعدد زبانوں کی طرح اردو کا دامن بھی سانیٹ کی صنف سے خالی نہیں ہے۔ اردو میں سانیٹ نگاری کا سلسلہ رواں صدی کے اوائل میں شروع ہوا اور نصفِ اول سے پہلے پہلے اپنا دورِ عروج دیکھ کر زوال آمادہ ہو گیا۔ بہر حال محدود پیمانے پر ہی سہی، آج کل بھی سانیٹ نگاری ہو رہی ہے۔ عظیم الدین احمد سے لے کر حنیف کیفی تک بیسیوں شاعروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں اختر شیرانی اور ن۔م۔راشد جیسے عہد ساز شاعر بھی شامل ہیں۔ اردو شاعروں نے قوافی کی بعض نئی ترتیبوں میں بھی سانیٹ نگاری کے کامیاب تجربے کیے اور پٹرارکی، اسپنسری اور شیکسپیئری سانیٹ بھی، ان میں سے ہر ایک کی مخصوص شرائط کو پورا کرتے ہوئے لکھے۔ البتہ اردو میں سانیٹ کو آئمبک پنٹامیٹر کے ساتھ مخصوص کر دینے کی شرط پوری نہیں کی گئی۔ ایسا ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ اس مغربی بحر کا آہنگ ہمارے عجمی اور ہندی ذوقِ نغمہ کے ساتھ مطابقت ہی

نہیں رکھتا۔ اس تفصیل سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ بحر کی تخصیص سے **قطع نظر**، سانیٹ کی ہیئت اور اس کی مختلف شکلیں اردو کی طبعزاد شاعری کے لیے بھی نئی نہیں ہیں۔ اس صورت میں ذوالفقار علی خان نؔقا کے لیے ترجمہ کرتے وقت، بحر کے معاملے میں آزاد رہتے ہوئے، شیکسپیئری سانیٹ کے دیگر ہیئتی امتیازات کی پابندی کرنا دشوار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایسا کرنے سے ایک تو مغربی سانیٹ کی روایت میں شیکسپیئر کے ہیئتی اجتہاد کا عملی طور پر اظہار و اعتراف ہو جاتا اور دوسرا یہ کہ ترجموں کی اپیل بصارت و سماعت، دونوں کے لیے بڑھ جاتی۔

اگرچہ، جیسا کہ بیان کیا گیا، ذوالفقار علی خان نؔقا نے تعدادِ مصاریع اور ترتیبِ قوافی جیسی ہیئتی پابندیوں سے اپنے آپ کو کلی طور پر آزاد رکھا ہے، تاہم اس کے باوجود کہیں کہیں بعض مصرعے ایسے بھی آجاتے ہیں جن کی بندش زیادہ رواں نہیں ہے اور تعقیدِ لفظی کے باعث جملوں کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ چند مقامات پر شتر گربگی کا احساس بھی ہوتا ہے حالانکہ اس مسئلے پر تھوڑی سی توجہ سے قابو پایا جا سکتا تھا۔ اسی طرح کچھ مصرعوں میں عربی اور فارسی کے ایسے مفرد الفاظ در آئے ہیں جو اردو میں محض ترکیب کی صورت میں مستعمل ہیں اور بصورتِ دیگر ان کے استعمال سے اجنبیت اور غرابت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض مصرعوں میں قارئین کی فارسی دانی پر اعتماد کرتے ہوئے ''داشتہ آید بکار'' (سانیٹ۔ ۴۸) اور ''خموشی معنیِ دارد کہ در گفتن نمی آید'' (سانیٹ۔۸۵) جیسے ٹکڑے بھی استعمال کر دیے گئے ہیں۔ پھر یہ کہ کہیں کہیں ترجمے کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے مترجم نے اپنا تخلص بھی استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ''آبِ گل'' میں مترجم کے طریقِ کار سے اختلاف کرنے کے مذکورہ مواقع جگہ جگہ بکھرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت محض آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

شیکسپیئری سانیٹ کی ہیئت اور تکنیک سے **قطع نظر**، ذوالفقار علی خان نؔقا نے، اردو کی متداول شعری لغت میں بالعموم بڑے رواں دواں ترجمے کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی توجہ زیادہ تر معنی و مفہوم کی ترسیل پر مرکوز رکھی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے

انھوں نے ہر ممکن حربہ استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر معنویت کو اجاگر کرنے کے لیے انھوں نے مذہبی و تہذیبی مصادر سے ماخوذ تلمیحات، روایات اور امثال کا سہارا بھی لیا ہے۔ چنانچہ ان کے تراجم میں قارون (سانیٹ۔۵۲)، ہاویہ (سانیٹ۔۱۲۹) آتشِ نمرود، دعوتِ شیراز (سانیٹ۔۱۴۴)، بابِ خیبر (سانیٹ۔۶۵) اور زید بکر (سانیٹ۔۲۹) جیسے حوالے بھی موجود ہیں۔ کہیں کہیں مقامی رنگ [مثلاً پوہ کی سردی (سانیٹ ۹۷)] بھی آ گیا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی "آبِ گل" کے اکثر تراجم معنوی سطح پر شیکسپیئر کے انگریزی سانیٹوں کے اچھے اردو متبادل ہیں اور ان سے شیکسپیئر کے مدعا تک بہ سہولت رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں راقم نے متعدد تراجم کا اصل متون کے ساتھ تقابل کر کے بھی دیکھا ہے، معنی و مفہوم کی ترسیل کے حوالے سے ہرگز مایوسی نہیں ہوئی۔ دو مثالیں آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

When I do count the clock that tells the time,
And see the brave day sunk in hideous night;
When I behold the violet past prime,
And sable curls, all silver'd o'er with white;
When lofty trees I see barren of leaves,
Which erst from heat did canopy the herd,
And summer's green all girded up in sheaves,
Borne on the bier with white and bristly beard,
The of thy beauty do I question make,
That thou among the wastes of time must go,
Since sweets and beauties do themselves forsake
And die as fast as they see others grow;
And nothing' gainst Time's scythe can make defence
Save breed, to brave him when he takes thee ence. (Sonnet 12) (۵)

....

جب منادی سنتا ہوں گھڑیال کی،
دیکھتا دن کو ہوں چھپتے رات میں،
یاد آتی ہے جوانی کی مجھے،
نقرئی اب بال ہیں کالے جو تھے،
اب شجر بے برگ و بے اثمار ہیں،
سائباں کا کام جو دیتے رہے۔
نعش تختے پر،
پراگندہ ہیں بال،
سر کے، ڈاڑھی کے تمام۔
پوچھتا ہوں حسن سے،
وقت لے جائے گا تم کو ساتھ میں،
چھوڑ دیتے ساتھ ہیں عشاق کا،
بلکہ اس دنیا کو بھی،
دیکھتے محبوب جب ہیں،
دوسروں کو بنتے رعنا نوجواں۔
روکنے کو وقت کی تلوار کو،
ڈھال یاں کوئی نہیں،
ہاں مگر تخلیق نو،
آفریں اس کو کہو،
اس کا جو باعث بنے۔ (سانیٹ ۱۲)

Betwixt mine eye and heart a league is took,

And each doth good turns now unto the other;

When that mine eye is famish'd for a look,

Or heart in love with sighs himself doth smother,

With my love's picture then my eye doth feast,

And to the painted banquet bids my heart;

Another time mine eye is my heart's guest,

And in his thoughts of love doth share a part;

So, either by the picture or my love,

Thyself away art present still with me;

For thou not further than my thonghts canst move,

And I am still with them and they with thee;

Or, if they sleep, the picture in my sight

Awakes my heart to hear's and eye's delight. (Sonnet 47) (۲)

میری آنکھیں اور دل لڑتے رہے،

درپئے آزار دونوں ہی رہے،

حرص آنکھوں کو ہے تیری دید کی۔

جبکہ تیری یاد میں دل،

بسمل و مجروح ہے۔

دیکھ کے تصویر تیری، آنکھ کو فرحت ملے،

اور تصور میں تجھے پاتا ہے دل۔

دوسرے لمحے کسی، آنکھیں قرینِ دل بھی ہیں،

بہرہ ور ہوتی محبت سے ہیں یوں،

ہے تری تصویر یا میری محبت کے طفیل۔

ذات تیری پاس میرے باوجودِ فاصلہ،

حدِ امکانِ تصور سے نہیں ہرگز پرے۔
میں تصوّر سے جدا ہوتا نہیں،
اور تصوّر ساتھ رہتا ہے مرے۔
تھک کے رہ جائے تصور جس گھڑی،
ہے تری تصویر آنکھوں میں مری۔
پُرمسرت سے بھی دل،
یاد و نظارہ ہیں دونوں فیض یاب۔ (سانیٹ ۴۷)

....

اس مختصر سے تقابلی جائزے کے بعد یقیناً آپ بھی میرے مؤقف کی تائید کریں گے۔ ''آبِ گل'' میں ایسے بہت سے ترجمے شامل ہیں جن میں اظہار و ابلاغ کے مراحل بحسن وخوبی طے کیے گئے ہیں۔ مزید یہ کہ اس طرح کے ترجمے اپنے طور پر بھی خوبصورت شعر پاروں کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ چند متفرق اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

......اے فراقِ دوست یہ احسان ہوگا اک عظیم،
مجھ کو مل جائیں گی کچھ......
فرصت کی گھڑیاں بے دریغ،
جب خیالِ یار بن جائے گا میرا میہماں،
ورنہ فکر و وقت مجھ سے دور رکھتے ہیں اسے،
جبکہ فرقت میں ہے رہتا پاس میرے وہ جلیس،
اس کی خدمت میں رہوں گا،
ہر گھڑی ہر روز میں۔ (سانیٹ ۳۹)

....

جب درختوں سے ہیں گرتے زرد برگ،
شاخِ گل ویران ہو جاتی ہے جب،

نیم مردہ چند پتوں کے سوا،
موسمِ سرما کے صدموں سے نڈھال،
''میری حالت کا ہے نقشہ ہو بہو''
آج ویرانہ بنا وہ مرغزار،
نغمہ زن جس میں ہزاروں تھے طیور۔ (سانیٹ ۷۳)

....

جب تصوّر اور تنہائی میں لاتا ہوں تجھے،
میرے شعروں کو جلا دیتی ہے تیری نیک خو،
اب کہ میری شاعری پر چھا رہا ہے اک زوال،
اور میرا نغمہ اب تمثیل اک نوحے کی ہے،
ہے مجھے اقرار اے جانِ حزیں،
کہہ رہا ہوں برملا،
تیری مدحت کے ہے شایاں اور کوئی باکمال۔ (سانیٹ ۷۹)

....

دو نہ میری عاشقی کو،
بت پرستی کا لقب،
نہ مرے محبوب کو ہی بت کہو،
ہیں مرے اقوال و شعر،
ذاتِ واحد کے لیے،
ذاتِ واحد جو کہ ہے،
آج تک، اور از ازل۔ (سانیٹ ۱۰۵)

....

تیرے تحفے، تیری تصویریں ہیں میرے ذہن میں،
جملہ تفصیلات تک محفوظ ہیں،
وقت کی ہیں قید سے آزاد یومِ حشر تک،
ورنہ جب تک باقی ہیں قلب ونظر،
اور کر دیتی نہیں ان کو تباہی بے نشاں،
تجھ کو تیری یاد کو ہونے نہ دوں گا محو میں۔ (سانیٹ ۱۲۲)

اور اب یہ اقتباس دیکھیے۔ اس میں تو کلاسیکی غزل کا بھرپور ذائقہ اپنے پورے رچاؤ کے ساتھ در آیا ہے:

...... یہ ترا رنگِ بنفشی جس پہ تو مغرور ہے،
حسن جس کا مثل رخسارِ جمالِ حور ہے،
سرخ تر ہے وہ رگوں میں دوڑتا پھرتا ہوا،
نرم و نازک ہاتھ اس کا یاسمیں جس سے خجل،
زلفِ پیچاں سے پریشاں سنبلِ تازہ چمن
لوٹتے جبکہ ہیں کانٹوں پر گلاب،
شرم سے پژمردہ یہ ہے اور وہ غم سے نڈھال،
تجھ میں دونوں کے ہیں رنگ ...... (سانیٹ ۹۹)

ذوالفقار علی خان بقا ''آبِ گل'' کے ابتدائیے (بیگار) میں اس کتاب کے نام کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''اس ترجمے کو 'آبِ گل' سے موسوم کیا ہے۔ گل کی خصوصیات کا حامل تو شیکسپیئر کا کلام

اورنخن ہے جبکہ آب، پھول پر پڑے ہوئے چند قطرے اوس کے ہیں، جو میری کاوش ہے۔ شاید 'جمال ہم نشیں' کے بعض اثرات ظاہر ہوں۔'' میری دانست میں 'آب گل' کے محولہ بالا اور ان کی طرح کے اور بھی بہت سے اقتباسات جمالِ ہم نشیں کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی موجودگی میں ''آب گل'' کو اردو تراجم کی دنیا میں ایک قابلِ قدر اور وقیع اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ غیر مطبوعہ کاوش کب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر نظر نواز ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(۱) W.J. Graig. Editor; Shakespeare Complete Works. London: Oxford University Press, 1966. Page 1106 - 1127.

(۲) Ibid - Page 1131 - 1135

(۳) ذوالفقار علی خان بقاؔ۔ گلِ صد برگ۔ لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، 1994ء

(۴) Zulfiqar Ali Khan Baqa. The Holy Quran and Administration of Justice. Lahore: Dr. S. A. Trust, 1995.

(۵) Shakespeare Complete Works. Page 1107.

(۶) Ibid - Page 1112